بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

ملک میں گذشتہ کئی ماہ سے انتخابِ صدارت کے معاملہ میں حزبِ اختلاف اور حزبِ اقتدار کے درمیان جو کشمکش ہو رہی تھی وہ فیلڈ مارشل محمد ایوب صاحب کی کامیابی پر منتج ہو چکی ہے یہ انتخاب کس حد تک غیر جانبدارانہ اور منصفانہ تھا، اس کی تفصیلات سے پورا ملک واقف ہے اس لیے ہم اُن دھاندلیوں اور زیادتیوں کا تذکرہ بالکل لاحاصل سمجھتے ہیں جو اس انتخاب میں کھلے بندوں کی گئیں۔ اُن کا ذکر ایک دلفگار داستان ہی نہیں بلکہ ضمیر پر ایک بوجھ ہے جس سے دل کانپ اٹھتا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ اُن ہاتھوں سے ہوا جنہیں قوم نے انہیں روکنے کا فرض سپرد کر رکھا تھا جب باڑھ ہی کھیت کو کھانا شروع کر دے تو پھر شکایت کیسی اور شکوہ کا کیا مقام۔ ہم ان حالات میں صرف اللہ ہی سے دعا کر سکتے ہیں۔ وہ مسبّب الاسباب غیب سے ملک اور قوم کی بہتری کے سامان پیدا کر دے۔

البتہ اس وقت ہم چند باتیں اپنے رفقاء کار اور اس ملک کے دین پسند طبقوں سے کہنا چاہتے ہیں۔

اپنی مخلصانہ سعی و جہد کے نتائج کو اپنی امیدوں اور توقعات کے خلاف پا کر انسان فطری طور پر دل گرفتہ ہوتا ہے۔ یہ ردِ عمل بالکل قدرتی ہے لیکن اس دل گرفتگی کو کبھی بھی مایوسی کی صورت میں ڈھلنے نہ دینا چاہیے خصوصاً ایک مسلمان کے قلب کے اندر تو یاس و قنوطیت کو کبھی راہ نہ پانی چاہیے۔

ایک مسلمان حیّ و قیّوم، رحیم و کریم، سمیع و بصیر اور مدبّر الامر خدائے واحد پر یقین رکھتا ہے۔ اس بنا پر اُس کے ایمان کا بنیادی اقتضا یہ ہے کہ وہ کارسازِ حقیقی کے فیصلوں پر سرِ تسلیم خم کر دے۔ اس کی مشیت نے جو فیصلہ کیا ہے وہی صحیح فیصلہ ہے خواہ وہ ہماری پسند یا توقعات سے کتنا ہی مختلف ہے۔ اللہ کی نظر سب سے زیادہ بالغ اور کائنات کے سارے گوشوں، اور ماضی، حال اور مستقبل کے سارے اَدوار پر حاوی ہے۔ اس لیے ہمیں دل کی گہرائیوں میں اس بات پر پُوری طرح مطمئن رہنا چاہیے کہ اُس نے جو کچھ کیا ہے، اسی میں خیر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم جس بات کے خواہشمند اور متمنی ہیں، اُس میں ہماری بہتری اور بھلائی کے بجائے ہمارا نقصان اور زیاں ہو اور جو چیز ہماری محدود نظر اور ناقص عقل کے مطابق ہمیں ضرر رساں دکھائی دے رہی ہے اُسی میں ہمارے لیے بہت سے خیر کے پہلو چھپے ہوئے ہوں۔

وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (البقرہ: ۲۱۶)

ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار ہو اور وہی تمہارے لیے بہتر ہو اور ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہی تمہارے لیے بُری ہو۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

ایک مسلمان کے لیے کامیابی اور ناکامی کے معیارات اور اعمال کو وزن کرنے کے پیمانے کچھ دوسرے ہی ہیں۔ جو شخص اس بات پر پختہ یقین رکھتا ہے کہ دنیا کے اس امتحان کے بعد آخرت میں اُسے اپنی کارگزاری کا پُورا پُورا صلہ ملے گا اور اس معاملے میں اُسے زیادہ سے زیادہ مراعات بھی حاصل ہوں گی اور اُس کی ذرہ برابر حق تلفی بھی نہ کی جائے گی، اُسے یہ کسی طرح زیب نہیں دیتا کہ وہ معمولی ناکامی پر دل شکستہ ہو جائے۔ اُس کی کامیابی اور ناکامی کا فیصلہ خارجی دنیا میں نہیں کیا جا سکتا بلکہ اُسے اس کا اندازہ کرنے کے لیے دل کی دنیا پر نگاہ ڈالنی چاہیے۔ اُس نے جو نیک عمل کیا ہے، حق کی سربلندی کے لیے جس قدر مصائب اٹھائے ہیں اور اللہ کی راہ میں جس قدر

ایثار سے کام لیا ہے، اُس کی تہ میں اگر رضائے الٰہی کا جذبہ کارفرما ہے تو وہ کامیاب ہی ہے خواہ دنیاوی نقطۂ نظر سے اُسے شدید ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہو۔ اور اس کے مقابلے میں اگر اسے معمولی سی جدوجہد کے صلے میں دنیا کی کامرانیاں اور فتح مندیاں حاصل ہو گئی ہوں لیکن اس جدوجہد کے محرکات رضائے الٰہی کے علاوہ کچھ دوسرے ہوں تو مسلمان کی نظر میں یہ سراسر ناکامیاں ہیں۔

اس بنا پر ہمارے رفقاء کو اس وقت اپنے دلوں کو ٹٹول کر یہ دیکھنا چاہیے کہ آخر انہوں نے اپنے آرام و آسائش کو تیاگ کر کانٹوں بھری جو دشوار گزار راہ اختیار کی ہے اُس میں اُن کے پیشِ نظر کیا مقصد ہے۔ اگر یہ مقصد محض دنیا کا حصول ہے تو وہ اول تا آخر ناکام ہی ناکام ہیں۔ لیکن اگر ان کا مقصد حق تعالیٰ کی خوشنودی اور اخروی فلاح ہے تو پھر اس طرح کے حادثات کو دیکھ کر انہیں کسی طرح بھی دل شکستہ نہ ہونا چاہیے۔

قرآن مجید میں مسلمان کو صبر کی جو بار بار تلقین کی گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مومن صرف اسی زادِ راہ کے سہارے تسلیم و رضا کے راستے پر گامزن ہو سکتا ہے۔ اگر وہ اس متاع سے محروم ہے تو وہ قدم قدم پر یاس و قنوطیت کا شکار ہو گا۔ دین کی راہ کوئی پھولوں کی سیج نہیں بلکہ مصائب اور پریشانیوں کی راہ ہے، مخالفتوں اور مخاصمتوں کی راہ ہے، فقر و فاقے کی راہ ہے۔ جس کی منزل اِس دنیا پر ختم نہیں ہوتی بلکہ اس دنیا سے دُور آخرت میں جا کر ختم ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآنِ مجید میں اللہ کے پاکباز بندوں کے ایمان اور طرزِ عمل کا ذکر ان بلیغ الفاظ میں کیا گیا ہے:

اَلَّذِیْنَ یُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا یَنْقُضُوْنَ الْمِیْثَاقَ وَالَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ وَیَخْشَوْنَ

اور اُن کا طرزِ عمل یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پُورا کرتے ہیں، اُسے مضبوط باندھنے کے بعد توڑ نہیں ڈالتے۔ اُن کی روش یہ ہوتی

رَبَّهُمْ وَيَخَافُونَ سُوْءَ الْحِسَابِ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ (الرعد ۲۰-۲۲)

ہے کہ اللہ نے جن جن روابط کو برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے انہیں برقرار رکھتے ہیں، اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں ان سے بُری طرح حساب نہ لیا جائے۔ اُن کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنے رب کی رضا کے لیے صبر سے کام لیتے ہیں۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف احیاء علوم الدین میں اس موضوع پر بڑی فکر انگیز بحث کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ صبر کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ آدمی اپنے رب اور خالق کو پوری طرح جانتا اور پہچانتا ہو۔ کیونکہ جب تک اُس کا اپنے مالک پر ایمان پختہ نہیں ہوتا اس وقت تک وہ اُس کی رضا کے لیے کوئی دکھ بھی اٹھانے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو صبر درحقیقت اللہ رب العالمین پر ایمان کی عملی شہادت ہے۔ اس ضمن میں اُن کے اپنے الفاظ قابلِ غور ہیں:

ولكن الصبر نصف الايمان باعتبارين وعلى مقتضى اطلاقين احدهما ان يطلق على التصديقات والاعمال جميعا فيكون للايمان ركنان: احدهما اليقين والآخر الصبر والمراد باليقين المعارف القطعية الحاصلة بهداية الله تعالى عبده الى اصول الدين والمراد بالصبر العمل بمقتضى اليقين

صبر کو دو اعتبار سے نصف ایمان کہا جاتا ہے اور ایمان کے دونوں ہی معنی اس بات کے مقتضی ہیں کہ صبر نصف ایمان ہو۔ اوّل ان معنوں میں کہ ایمان کو تصدیقات یعنی معارف اور اعمال دونوں کے لیے بولا جائے۔ اس صورت میں ایمان کے دو رکن ہونگے۔ ایک یقین اور دوسرا صبر۔ یقین سے مراد دین کے وہ معارف ہیں جو بندے کو خداوند تعالیٰ کی ہدایت سے حاصل ہوتے ہیں اور صبر سے مقصود عمل کرنا ہے یقین سے انسان کے اندر

یعرفه ان المعصیة ضارة والطاعة نافعة ولا یمکن ترک المعصیة و المواظبة علی الطاعة الا بالصبر (جلد ۴ ص ۶۱)	گناہ کے مضر اور طاعت کے مفید ہونے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ صبر کے ذریعہ انسان معصیت کو ترک اور اطاعت میں مداومت اختیار کر سکتا ہے۔

نتائج سے بے پروا ہو کر راستی اور صداقت کی راہ پر مستقل قائم رہنا اسی صورت میں ممکن ہے جب انسان کو اپنے خالق و مالک کی ذات پر پورا پورا اعتماد ہو اور اُسے اس بات کا پورا یقین ہو کہ اس نے جس راہ کو اختیار کر رکھا ہے وہی فوز و فلاح کی راہ ہے اور صرف یہی ایک راہ اُسے اپنے حقیقی مقصد تک پہنچا سکتی ہے۔ جن خوش نصیب حضرات کے قلب و دماغ میں خداوند تعالیٰ کے بارے میں یہ غیر متزلزل ایقان اور اُس کے نازل کردہ دین کے متعلق یہ پختہ یقین پیدا ہو جاتا ہے انہیں نہ تو کنارہ چھوٹنے کا غم ستاتا ہے اور نہ مخالفتوں اور مخاصمتوں کے طوفان ہی انہیں مضمحل کرنے پاتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ (الاحقاف۔ آیت ۱۳)	بے شک جنہوں نے کہا ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر وہ اس پر جمے رہے تو انہیں نہ تو کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غم ہی کھائیں گے۔

اس سلسلے میں ایک ضروری چیز یہ بھی ذہن نشین رہے کہ اسلام میں صبر کی اصطلاح اپنے ایک مخصوص معنی اور مزاج رکھتی ہے۔ یہاں صبر سے مراد وہ رواقی لاپروائی (STOICISM) نہیں ہے جو ہمیں اہلِ روما اور اُن کی تقلید میں آج کی مغربی قوموں میں نظر آتی ہے۔ یعنی انسان ایک مغرورانہ احساس کے ساتھ ہر قسم کے مصائب اور تکلیفات کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرے۔ یہ اندازِ فکر بالکل غیر فطری ہے اور اس سے انسان کے اندر تکبر اور نخوت کے احساسات پرورش

پاتے ہیں۔ مصیبت بہرحال مصیبت ہے اور اس کے فطری اثرات سے اغماض برتنا اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے۔ چنانچہ رواقی انداز فکر شخصیت کی تعمیر میں ممد و معاون ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس سے انسان کے بہت سے مفید احساسات مضمحل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اسلام نے ہمیں جس صبر کی تلقین کی ہے اس سے ایک تو انسان کے فطری احساسات کو نشوونما پانے کا موقع ملتا ہے اور دوسرے اس کے اندر غرور اور تکبر کی جگہ رجوع الی اللہ کا شوق بڑھتا ہے۔ چنانچہ اسلام ایک انسان کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ وہ جب کبھی بھی مصیبت اور ناکامی سے دوچار ہو تو اسے اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کا نتیجہ سمجھے، مالک الملک کے سامنے اُسے اپنی بے بسی اور بے چارگی کا احساس اور شعور پیدا ہو۔ اور ناکامی کی چوٹ کو مغرورانہ احساس کے ساتھ نظرانداز کرنے کے بجائے وہ اس ذات کو راضی کرنے کے لیے بے تاب ہو جس کے ہاتھ میں نفع و نقصان کی کلید ہے۔ قرآن مجید نے اس حقیقت کی نہایت واضح الفاظ میں صراحت فرمائی ہے:

اِسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰہِ وَاصْبِرُوْا (الاعراف - ۱۲۸) اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو۔

یعنی تمہارا صبر کسی مغرورانہ احساس کا نتیجہ نہ ہو بلکہ اُس صبر میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی قوت اور اس کی تائید اور نصرت کی شدید ضرورت کا گہرا شعور ہو۔

پھر ایک دوسرے مقام پر یہ فرمایا ہے:

وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (الانفال - ۴۶) صبر سے کام لو، یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

یعنی تمہاری مستقل مزاجی، استقامت اور نقصان و تکلیف پر تمہارا صبر تمہاری اپنی کسی ذاتی قوت یا قابلیت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ راہِ حق کی مشکلات کو پامردی سے برداشت کرنے والوں کی قدم قدم پر معاونت اور دستگیری کرتا ہے:

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰہِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَیْہِمْ وَلَا تَكُ فِیْ ضَیْقٍ مِّمَّا صبر سے کام کیے جاؤ۔ اور تمہارا یہ صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے۔ ان لوگوں کی حرکات پر رنج نہ کرو

يَنْكُرُوْنَ (النحل - ۱۲۸) اور نہ ہی ان کی چالبازیوں پر دل گرفتہ ہو۔

ایک دوسرے مقام پر اس حقیقت کی وضاحت یوں فرمائی:

اَلَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰی رَبِّھِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ۔ (النحل - ۴۲)
جنہوں نے صبر کیا اور جو اپنے رب کے بھروسے پر کام کر رہے ہیں۔

یعنی اُن کی ہمت، اُن کا عزم اور استقلال اُن کا کوئی ذاتی جوہر نہیں بلکہ اپنے رب پر توکل اور اعتماد کا ثمرہ ہے۔ پھر قرآن مجید ایک مسلمان کو اس حقیقت سے بھی آگاہ کرتا ہے کہ صبر کا وصف محض ایک نظریۂ حیات کو اپنانے یا زندگی کے متعلق ایک خاص طرزِ فکر اختیار کرنے ہی سے پیدا نہیں ہو جاتا بلکہ اس کی پرورش اور صحت مند نشو و نما کے لیے ہمیں اُن تمام ذرائع کو اختیار کرنا چاہیے جو اللہ پر یقین پیدا کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ ان سارے ذرائع میں سے سب سے زیادہ مؤثر ذریعہ یادِ الٰہی ہے۔

فَاصْبِرْ عَلٰی مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ آنَآئِ اللَّیْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰی۔ (طٰہٰ - ۱۳۰)
جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں اُن پر صبر کرو۔ اور اپنے رب کی حمد و ثنا کے ساتھ اُسی کی تسبیح کرو، سورج نکلنے سے پہلے اور غروب ہونے سے پہلے اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کرو اور دن کے کناروں پر بھی۔ شاید کہ تم راضی ہو جاؤ۔

قرآن مجید میں ایک جگہ نہیں بلکہ کئی مقامات پر صبر اور صلوٰۃ کا یکجا ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۔ وَاِنَّهَا لَكَبِیْرَةٌ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ (سورہ البقرہ - ۴۵) یعنی صبر اور صلوٰۃ سے مدد حاصل کرو بلا شبہ نماز ایک سخت مشکل کام ہے، مگر خدا سے ڈرنے والوں کے لیے نہیں۔

امام غزالیؒ نے صبر کی بحث میں یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ صبر کی ضرورت مصیبت کے وقت

ہی پیش نہیں آتی بلکہ اس کی سب سے زیادہ احتیاج اُن لوگوں کو بھی ہوتی ہے جن کے پاس مال و متاع کی فراوانی ہو، عز و جاہ کے اونچے اور بلند مناصب ہوں اور انہیں اپنے مقاصد میں کامیابی اور کامرانی نصیب ہو۔ ان حالات میں انسان میں بالکل فطری طور پر غرور اور تکبّر کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں اور شیطان اُس کے اندر گھس کر بڑی آسانی کے ساتھ اسے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور طغیان کے راستے پر ڈال دیتا ہے آپ اس سلسلے میں اُس عارفِ ربّانی کی تصریحات ملاحظہ فرمائیں:

"بندۂ مومن کو ہر حال میں صبر کرنا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان عام طور پر زندگی میں دو قسم کے حالات سے گزرتا ہے۔ یا تو اس کی خواہشوں اور تمناؤں کی تکمیل ہوتی ہے یا ان میں اُسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ موافق حالات کی صورت یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ صحت، تندرستی، مال و جاہ جیسی نعمتیں کثرت کے ساتھ عطا فرمائے۔ ان نعمتوں کی فراوانی اُس کے لیے بڑی آزمائش ہے۔ وہ ان میں کھو کر اپنے مالک سے سرکشی کا ارتکاب کرتا ہے۔ یہ چیز انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ جب اپنے آپ کو غیر مسئول اور بے نیاز سمجھنے لگتا ہے تو وہ گمراہی کے راستے پر پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰٓی اَنْ رَّاٰہُ اسْتَغْنٰی۔ اسی آیت کی تشریح کرتے ہوئے بعض عارفین نے کہا ہے: البلاء یصبر علیہ المؤمن والعوافی لا یصبر علیہا الا صدیق "بلا پر تو ہر بندۂ مومن صبر کرتا ہے لیکن عافیت پر صبر کرنا صرف صدیق کا کام ہے۔ اور حضرت سہیل فرماتے ہیں کہ عافیت اور فراوانی پر صبر کرنا مصیبت پر صبر کرنے کی بہ نسبت زیادہ مشکل ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر جب دنیاوی نعمتوں کی بارش ہوئی تو انہوں نے ارشاد فرمایا؟ جس وقت فقر و فاقہ سے ہماری آزمائش کی گئی تو ہم نے صبر کیا۔ مگر جب فتنۂ تونگری میں ہم مبتلا ہوئے تو اُس معیار کو برقرار نہ رکھ سکے جو ضروری تھا۔" (احیاء علوم الدین جلد ۴ ص ۶۵-۶۸)

ہم جہاں اپنے رفقاء کار کو صبر اور تسلیم و رضا کی تلقین کرتے ہیں وہاں ہم صداقتی انتخاب جیتنے والے حضرات سے بھی یہ عرض کرتے ہیں کہ وہ براہِ کرم اپنی اس فتح مندی پر نازاں ہونے اور غرہ کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ اُس پروردگار عالم نے انہیں سنبھلنے، اپنی روش پر نظر ثانی کرنے اور اپنے طرزِ عمل کو بدلنے کا مزید ایک موقع دیا ہے۔ دنیا کی عارضی کامیابیاں لازمی طور پر حق و صداقت کی فتح کی علامت ہی نہیں ہوتیں بلکہ کبھی اللہ تعالیٰ اپنی حکمتِ بالغہ کے تحت کسی فرد یا گروہ پر انعام و اکرام کی بارش کر کے یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اُس نے اپنے مالک کا کس حد تک شکر ادا کیا ہے اور کبھی اُسے دنیاوی نعمتوں سے پوری طرح نواز کر اُسے اس امر کی کھلی چھٹی دے دیتا ہے کہ وہ سرکشی اور بغاوت میں اپنے دل کے پورے ارمان نکال لے اور اپنے عمل سے پوری طرح ثابت کر دے کہ اُس کے اندر خدا ترسی کا کوئی جوہر باقی نہیں رہا۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ ۭ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ ۡ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (الانعام رکوع ۲۰)

وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا، اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں زیادہ بلند درجے دیئے تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ بے شک تمہارا رب سزا دینے میں بھی تیز ہے اور بہت درگزر کرنے اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ۭ فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَاۗءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (یونس رکوع ۲)

اگر کہیں اللہ لوگوں کے ساتھ برا معاملہ کرنے میں بھی اتنی ہی جلدی کرتا جتنی وہ ان کے ساتھ بھلائی کرنے میں جلدی کرتا ہے تو اُن کی مہلتِ عمل کبھی کی ختم کر دی گئی ہوتی (مگر ہمارا طریقہ یہ نہیں ہے) اس لیے ہم اُن لوگوں کو جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے اُن کی سرکشی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔

بطنِ مستقبل میں جو کچھ پنہاں ہے اُس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ غیب کا علم صرف اللہ ہی کو ہے۔ ہم اُن مصلحتوں کو بھی سمجھنے سے قاصر ہیں جن کے تحت خداوند تعالیٰ نے موجودہ حکمرانوں کو حکومت کے مزید مواقع عطا کیے ہیں البتہ ہم ایک بات پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں اور وہ یہ کہ ان حضرات کو تلافیٔ مافات کا ایک نہایت ہی نادر موقع ملا ہے۔ وہ جن طریقوں اور حربوں سے کامیاب ہوئے ہیں ان کا انہیں پوری طرح علم ہے۔ اخبارات میں وہ جس قسم کے چاہیں بیانات دیتے رہیں اُن کی زبان پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی لیکن شاید اُن کی آنکھوں سے یہ حقیقت اب بالکل اوجھل نہیں رہی کہ وہ عوامی تائید سے محروم ہیں۔

اس تلافی کی ہمارے نزدیک بہترین صورت یہ ہے کہ وہ اپنے حاشیہ برداروں اور خوشامدیوں کے نرغے سے نکل کر ٹھنڈے دل و دماغ سے حالات کا جائزہ لیں، قوم کے دل کی دھڑکنوں کو خود اپنے کانوں سے سُنیں اور اپنی آنکھوں سے اُس کے چہرے کے اُن نقوش کا مشاہدہ کریں جو ایک شدید کرب اور گہرے اضطراب کی زبانِ حال سے شہادت دے رہے ہیں۔ آخر غور کیجیے کہ کیا اس قوم نے جان و مال اور عزت و آبرو کی بے مثال قربانیاں دے کر اس خطۂ ارضی کو محض اسی لیے حاصل کیا تھا کہ بدیشی آقاؤں کی جگہ کچھ دیسی آقا اس کی گردن پر مسلط ہو جائیں، اس کے اپنے ملک میں اس کا دین مظلوم بن کر رہ جائے، اس پر حکومت انہیں ظالمانہ اور جابرانہ قوانین کے ذریعے کی جائے جو غیر ملکی قوم نے محض اپنے استعماری عزائم کی تکمیل کے لیے وضع کر رکھے تھے ؟

مسلمان قوم بے شعور بھیڑوں کا کوئی گلہ نہیں جسے لاٹھی کے زور سے ہر طرف ہانکا جا سکتا ہو۔ یہ جیتے جاگتے اور باشعور انسانوں کی ایک ایسی منظم جماعت ہے جو اگرچہ اس دور میں پس کر رہ گئی ہے، تاہم اپنا ایک شاندار اور درخشاں ماضی رکھتی ہے، جس کا زندگی کے انفرادی اور اجتماعی مسائل کے بارے میں ایک خاص اندازِ فکر اور ایک مخصوص زاویۂ نگاہ ہے، جو ایمان، ضمیر اور اخلاق کے متعلق اپنے ایک مخصوص مزاج کی مالک ہے۔ جس کے سینے میں آج بھی اسلام کی محبت کی چنگاریاں موجود ہیں، جو اگرچہ حرص و آز کی خاک کے ڈھیر میں دب کر رہ گئی ہیں لیکن ابھی ٹھنڈی نہیں ہوئیں۔

جونہی دین پر ضرب پڑتی ہے یہ فوراً بھڑک اٹھتی ہیں۔

تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ آج تک جس فرد یا گروہ نے بھی اس قوم کے مخصوص مزاج کو سمجھنے میں کوتاہی کی ہے اُس نے اپنا اور اس ملت کا زبردست نقصان کیا ہے۔ اس بنا پر ہم موجودہ حکمرانوں سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ اس تاریخی حقیقت کو نگاہ میں رکھ کر کوئی قدم اٹھائیں۔ اُن سے اس معاملہ میں پہلے جو کوتاہیاں ہو چکی ہیں ان کے تلخ نتائج کا اندازہ وہ سالیہ انتخابات میں کسی حد تک لگا چکے ہوں گے اس لیے انہیں اب ان غلطیوں کا اعادہ نہ کرنا چاہیے بلکہ قوم اور ملک کی بہتری اور خود اپنی بھلائی کے پیشِ نظر انہیں اُس ظلم و استبداد اور ان سماجی ناانصافیوں سے دامن بچانا چاہیے جنہوں نے ہماری قومی زندگی کو جہنم بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم اور ضروری چیز یہ ہے کہ اسلام کے واضح احکامات کی جو خلاف ورزیاں اب تک کی جاتی رہی ہیں اور فسق و فجور اور فواحش کی جو سرپرستیاں ہوتی رہی ہیں اُن سے فوری طور پر دستکش ہو جانے ہی میں اُن کی عزت کا راز مضمر ہے یہ سارے اقدام اگرچہ سلبی نوعیت کے ہیں اور ان سے وہ بلند اور پاکیزہ مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے جن کے حصول کے لیے پاکستان معرضِ وجود میں آیا ہے۔ تاہم ہمیں امید ہے کہ یہ سلبی اقدام بھی اس سحر کے طلوع ہونے میں ممد و معاون ثابت ہوں گے جس کی آرزو میں لاکھوں انسانوں نے تقسیم ملک کے وقت جانیں دی تھیں۔ دوسری طرف ان اقدامات سے بدگمانی کا وہ سلسلہ ختم ہونا شروع ہو جائیگا جو برسرِ اقتدار گروہ کے خلاف ملک کے طول و عرض میں پایا جاتا ہے یا کم از کم وہ نفرت و بیزاری کی شدت تو باقی نہ رہے گی جو پچھلے تین چار مہینوں سے سارے ملک میں یہ حضرات خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔

بے جا نہ ہوگا کہ ان گزارشات کے ساتھ اربابِ اختیار کی خدمت میں ہم یہ بات بھی عرض کر دیں کہ سماج دشمن عناصر خواہ انتخابات میں کتنے ہی مفید اور کارآمد کیوں نہ ہوں لیکن یہ ملک اور قوم کے لیے کسی طرح بھی فائدہ مند نہیں ہوتے۔ عارضی اور وقتی فائدوں کے لیے انہیں جس طرح

کھلی چھٹی دی جارہی ہے اور ان کو بے تحاشا مسلح کیا جارہا ہے، یہ انتہائی خطرناک ہے۔ ان کے حوصلے جس حیرت انگیز سرعت کے ساتھ بڑھ رہے ہیں، اگر ان کا کوئی فوری اور مؤثر تدارک نہ کیا گیا تو یہ یقیناً نہ صرف ملک اور قوم کے لیے شدید عذاب کا باعث ہوں گے بلکہ خود آپ کی عزت و آبرو بھی ان کے ہاتھ سے محفوظ نہ رہ سکے گی۔ جو شخص یا گروہ خود اپنا دشمن بن کر غنڈہ گردی کو اپنی زندگی کا شعار بنا لیتا ہے، اس سے یہ توقع کرنی کہ مفادات کے تبدیل ہونے کے ساتھ ہی وہ آپ کی دشمنی پر آمادہ نہ ہو جائے گا، پرلے درجے کی سادگی بلکہ کم فہمی ہے۔ اس لیے خدارا ملک پر رحم کیجیے اور ان لوگوں کی پیٹھ ٹھونکنے اور اُن کی "خدماتِ جلیلہ" سے فائدہ اٹھانے کے بجائے ملک اور قوم کے لیے کوئی تعمیری کام کر کے رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کیجیے۔ ان بدقماش افراد کی اس وقت جس طرح سرپرستی کی جارہی ہے اس سے ممکن ہے آپ کو وقتی طور پر کچھ فائدہ پہنچ جائے، لیکن اس عاقبت نااندیشانہ طرزِ عمل سے ایسے حالات پیدا ہو جائیں گے جن کے نتیجے میں شرافت اور نیکی پس کر رہ جائے گی اور پورا ملک لاقانونیت کی لپیٹ میں آجائے گا۔ ہمارے لیے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ اپنی مخصوص اغراض کی برآری میں آپ اس حد تک کھو چکے ہیں کہ اس غلط طرزِ عمل کے بد اثرات تک آپ کی نگاہ نہیں پہنچ رہی۔ قومیں شرافت، نیکی، صبر و تحمل اور بُردباری سے پنپتی ہیں، غنڈہ گردی اور ضمیر فروشی سے پروان نہیں چڑھتیں۔ جس فرد، گروہ یا قوم نے بھی انہیں پرورش کرنے کا موقع دیا ہے اُس نے خود اپنی موت کو دعوت دی ہے۔

ہم اس ضمن میں اس ملک کے شہریوں سے بھی یہ اپیل کرنا چاہتے ہیں کہ وہ بھی خدا کے لیے اس تشویشناک صورتِ حال پر غور کریں اور اس معاملے میں غیر متعلق تماشائی بن کر زندگی نہ گزاریں۔ غنڈہ گردی کا جو سیلاب یہاں بڑی سرعت کے ساتھ امڈ رہا ہے اس سے اگر آج آپ، کی ذات، آپ کا خاندان اور گھر محفوظ ہیں تو اس امر کی کوئی ضمانت نہیں کہ وہ کل اس کی زد میں آنے والے نہیں ہیں۔ اس سیلاب کے بند اگر ایک مرتبہ ٹوٹ گئے تو پھر نہ کسی کی جان بچے گی نہ عزت و آبرو۔

اس لیے اس ملک کے ہر حساس، ذی شعور اور دردمند شہری کو ابھی سے اس کے روکنے کی فکر کرنی چاہیے۔ اس کی سب سے زیادہ مؤثر صورت یہ ہے کہ شرفا کے اندر جذبۂ تعاون اور ہمدردی پیدا ہو۔ ایک کا گھر لٹتا دیکھ کر دوسرا چین اور آرام سے نہ بیٹھا رہے۔ اگر چند سماج دشمن عناصر باہم مل کر ملک کی پوری معاشرتی زندگی کو عذاب بنا سکتے ہیں تو آخر کیا وجہ ہے کہ شریف شہریوں کا اتحاد و اتفاق ان کا تدارک کرنے میں ناکام رہے۔

ہمیں یقین ہے کہ یہاں کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں جو اس بات کا خواہشمند ہو کہ اُس کی جان و مال اور عزت و آبرو کو ہر وقت خطرہ لاحق رہے۔ جو لوگ آج ان عناصر کو شہ دے رہے ہیں وہ بھی اس بات کو کبھی گوارا نہیں کریں گے کہ ان عناصر کی "کارگزاری" کا رُخ خود اُن کی اپنی ذات کی طرف پلٹ جائے۔ جان و مال کی حفاظت اور عزت و آبرو کی پاسبانی انسان کا فطری جذبہ ہے۔ کوئی شخص بھی خوف و ہراس کے ماحول میں زندگی بسر کرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے ملت کے تمام افراد کا یہ فرض ہے کہ وہ نظریات کے اختلاف کے باوجود ان سماج دشمن عناصر کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کریں۔

ملک میں اغوا، ڈکیتی اور قتل و غارت کی بڑھتی ہوئی وارداتیں ایک نہایت مہیب طوفان کا پتہ دے رہی ہیں۔ اگر اس کے سدِباب کے لیے بروقت مؤثر تدابیر اختیار نہ کی گئیں تو درسگاہوں، بازاروں اور اجتماعی زندگی کے دوسرے مراکز میں ہمارا اور ہماری اولاد کا جو حشر ہوگا وہ تو خیر ہوگا ہی۔ گھر کی چار دیواری میں بھی کسی خاندان کی عزت و آبرو محفوظ نہ رہ سکے گی۔

حالیہ صدارتی انتخابات میں جماعت اسلامی پاکستان اور اُس کے امیر نے جو موقف اختیار کیا اُسے گزشتہ چند ماہ سے جس طرح ہدفِ تنقید بنایا جا رہا ہے، اس کا یہ پہلو بڑا تکلیف دہ ہے کہ اس میں بعض دیندار حلقوں نے اس احساسِ ذمہ داری کا ثبوت نہیں دیا جس کی ان سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی تھی۔ اختلافِ رائے

کوئی قابلِ نفرت چیز نہیں بشرطیکہ اس میں انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے اور اس کے پیچھے خیر خواہی کا جذبہ کارفرما ہو۔ ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جماعت اسلامی اور بالخصوص اس کے امیر مولانا سیّد ابُوالاعلیٰ مودودی پر تنقید کرتے وقت بہت سے علمائے دین تنقید کے اُن آداب اور اُس حزم و احتیاط کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں جس کا وہ صبح و شام پرچار کیا کرتے ہیں۔ جماعت اسلامی کو یہ موقف کن ناگزیر حالات کے تحت اور کن دینی مصالح کی خاطر اختیار کرنا پڑا اُس کا ذکر اس قرارداد میں موجود ہے جو جماعت کی مجلس مشاورت نے اس موقع پر جبکہ مولانا جیل میں تھے منظور کی تھی اور جس کی مزید وضاحت ترجمان القرآن کے گزشتہ شمارے میں کر دی گئی ہے۔

جن حضرات کو مولانا یا جماعت اسلامی کے اس فیصلے سے شرعی اعتبار سے اختلاف تھا اور وہ اس فیصلے کو دلائل سے غلط ثابت کرنا چاہتے تھے اُن کے لیے معقول روش یہ تھی کہ قلم کو حرکت میں لانے سے پیشتر اُن تصریحات کو ذہن میں رکھتے جو جماعت نے اِس ضمن میں پیش کی ہیں۔ لیکن یوں نظر آتا ہے کہ ان حضرات کو کسی شرعی مسئلہ کی تنقیح و وضاحت سے زیادہ اس بات کی فکر دامنگیر تھی کہ کسی طرح مولانا کے خلاف دل کی بھڑاس نکالنے کے اس زرّیں موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے اور اگر مولانا کے موقف پر شرعی زاویۂ نگاہ سے کوئی گرفت نہ کی جا سکتی ہو تو ان کی طرف بعض ایسی باتیں منسوب کر دی جائیں جو طعن و تشنیع کے لیے مواد فراہم کر سکیں۔

آپ ان حضرات کی تحریروں کا اگر مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کے الزامات کی بنیاد اُن بیانات پر رکھی گئی ہے جو اخبارات میں مولانا کی طرف منسوب کیے گئے تھے۔ حالانکہ جو کوئی مولانا کے طرزِ کلام سے واقف ہے وہ بادنیٰ تامل ان بیانات کو دیکھ کر سمجھ سکتا تھا کہ یہ ٹھیک مولانا کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ نامہ نگار کے الفاظ ہیں پھر یہ حقیقت بھی کسی صاحبِ نظر سے پوشیدہ نہیں کہ اخباری رپورٹیں کبھی بھی پوری صحت کے ساتھ مرتب نہیں کی جاتیں۔ ان میں اخبارات کی پالیسی کو بہت کچھ عمل دخل ہوتا ہے۔ چنانچہ مولانا کی تقریروں کا یہی حشر ہُوا۔ وہ اخبارات جو مولانا کے خلاف اُدھار کھائے بیٹھے تھے انھوں نے جان بوجھ کر اُن کے بیانات کو توڑ مروڑ کر شائع کیا۔ باقی رہے وہ اخبارات جنہیں مولانا

سے کوئی پرخاش نہ تھی اُن کے لیے بھی کسی فقہی مسئلے کو اُس جچی تلی اور محتاط زبان میں بیان کرنا مشکل تھا جو فقہ میں استعمال کی جاتی ہے۔ ایک طرف یہ دقتیں تھیں اور دوسری طرف یہ بات بھی عملاً ناممکن تھی کہ مولانا ہر روز ان اخباری رپورٹوں کی تردید کرتے رہیں اور اگر وہ کرنا بھی چاہتے تو کہاں تک کر سکتے تھے۔ پھر جو حضرات اخبار نویسی کا کچھ تجربہ بھی رکھتے ہیں، انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ اخبارات اپنے کسی شاف رپورٹر کی مرتب کردہ خبر کی تردید کرنے پر آسانی سے آمادہ نہیں ہوتے۔ چنانچہ جو حضرات مولانا کو بدنام کرنے پر تُلے بیٹھے تھے انھوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور نامہ نگاروں کی غیر مستند رپورٹوں کو بنیاد بنا کر اُن پر برسنا شروع کر دیا اور اس معاملے میں بعض حضرات نے تو یہ غضب کیا کہ اخبار میں شائع ہونے والی رپورٹوں کو بھی پوری طرح نقل کر کے تنقید نہیں کی بلکہ ان میں سے ایک، آدھ فقرہ نکال کر اس پر ایک پورا مضمون لکھ دیا ہے۔ ہم اس سلسلے میں صرف اسی قدر کہنا چاہتے ہیں کہ اس قسم کی فن کاریاں دنیا داروں کو تو زیب دیتی ہیں مگر اُن حضرات کو زیب نہیں دیتیں جو اللہ اور رسول کی تعلیمات کے امین ہیں۔